بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اوّلاً یہ معذرت طلبی کہ ترجمان القرآن کے سابق شمارے میں بہت سی غلطیاں رہ گئیں۔ مزید یہ کہ اگست کا شمارہ بہت تاخیر سے آپ تک پہنچ رہا ہے اور دونوں کی وجہِ مشترک یہ کہ مجھے میز پر کام کرتے کرتے یکایک اُٹھ کے امریکہ روانہ ہو جانا پڑا۔

اب میں اس کوشش میں ہوں کہ جس شمارے (ستمبر) کے یہ اشارات ہیں، وہ صحتِ کتابت و طباعت کے لحاظ سے بھی قابلِ اطمینان ہو، اور کسی بڑی تاخیر کے بغیر، بلکہ وقت پر نکل سکے۔

مشکل یہ کہ میرا نہ کوئی نائب ایسا موجود ہے کہ جسے میں آگے کا کام سونپ جاتا، اور نہ مصروفیت کے اس دَور میں یہی ممکن ہے کہ کسی دوسرے رفیق سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ میرے خالی کردہ محاذ کو خالی نہ رہنے دیں گے۔

اب ذرا ہمارے سفر کی شان بھی تو دیکھیے کہ جیسے کوئی شخص خواب ہی خواب میں ہزاروں میل کی گردش کر لے۔

۱۹ر جون کو لاہور سے اور ۲۰ر کو کراچی سے روانگی۔ ۲۰ر کی دوپہر دوبئی کے ہوائی اڈے پہ اور رات ایک ہوٹل میں۔ ۲۱ر کو دوبئی سے، فرینکفرٹ اور پیرس ہوتے ہوتے لندن۔ رات یوکے اسلامک مشن کے دفتر میں قیام۔ ۲۳ر کی شام کو نیویارک، پھر فلوریڈا، ڈیٹرائیٹ، پھر انڈیانا پلس، پھر بالٹی مور، پھر واپس نیویارک، ۱۳ر جولائی کو نیویارک سے کاسابلانکا اور قاہرہ ہوتے ہوتے جدہ، ۱۶ر کو مکہ معظمہ، ۱۸ر کو مدینہ منورہ، ۱۹ر کو جدہ، ۲۰ر کو پھر مکہ معظمہ، ۲۱ر کو واپسی، ۲۲ر کی صبح کو کراچی اور دوپہر کو لاہور

میں "تشریف آوری"!

یوں سمجھیے کہ "بس پھر آنکھ کھل گئی"۔ پھر وہی ہم ہیں، پھر وہی غم!

"جب آنکھ کھل گئی تو موسم تھا خزاں کا"۔

مکانی لحاظ سے ہزاروں میل طویل، اور زمانی لحاظ سے تقریباً ایک ماہ میں محدود اس سفر کا بیش قیمت باب یہ تھا کہ محترم مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا لاہور سے ۱۴ مئی کو روانہ ہوئے تھے۔ میں ۱۹ جون کو چلا۔ اواخر جون (غالباً ۲۸ یا ۲۹ کو) ملاقات ہوئی۔ یعنی ایک مہینے کے وقفے سے۔

نیویارک پہنچنے کے تیسرے روز مولینا سے ٹیلیفونی رابطہ قائم کیا۔ سلام و آداب کے بعد عرض کیا کہ میں کسی دن حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ فرمایا کہ آپ جب چاہیں آجائیں، اور اپنے آنے سے پہلے ڈاکٹر (یعنی مولینا کے فرزند ڈاکٹر احمد فاروق) کو اطلاع دے دیں تاکہ وہ ایئرپورٹ سے اپنی گاڑی پہ لے آئے، کیونکہ یہاں تک آنے کا راستہ بہت مشکل ہے۔ بعد میں مشاہدے سے اس بات کو صحیح پایا۔

پھر ایک دن رختِ سفر باندھا، یعنی اپنا سفری بیگ ساتھ لیا اور ہوائی جہاز کے ذریعے غالباً دو گھنٹے میں بفیلو جا پہنچا۔ ہوائی اڈے سے ڈاکٹر صاحب کو فون کیا۔ پھر عمارت سے باہر آکر ان کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحب اور ان کے قریبی عزیز مسعود صاحب دونوں گاڑی میں آپہنچے۔ منزل تک جانے میں سہ پہر کا وقت ہوگیا۔ لہٰذا دن کا کھانا گول کیا۔ اور ڈاکٹر صاحب نے میرے حسبِ خواہش چائے کے ساتھ بسکٹ پھل وغیرہ فراہم کردیے۔ نمازِ عصر کے بعد مولانائے محترم اندرونِ خانہ سے اپنے "واکر" کے سہارے کشادہ ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ مجھے بلوایا گیا۔ اوپر کی منزل سے اتر کر حاضر ہوا۔ مصافحہ کے ساتھ ہی میں نے کہا کہ "مولینا آپ نے تو یہاں بھی کھینچ بلوایا"۔ جواباً مولینا نے غالباً کچھ ایسی بات کہی کہ جہاں ہم ہوں گے وہاں آپ کو آنا ہی ہوگا۔ پھر شاید یہ بھی کہ آخر آپ نے امریکہ دیکھ لیا۔ عرض کیا کہ ایسی کوئی خواہش میرے اندر نہ تھی۔ یوں بھی طبیعت سفر گریز ہوگئی ہے۔ پھر بات کا رخ مولینا کی صحت کے موضوع کی طرف مڑ گیا۔ ایک بات تو از خود ظاہر تھی، یعنی مولینا کی مجموعی ظاہری حالت اچھی تھی، چہرہ شاداب تھا، لہجے میں ابھار تھا، گفتگو میں بشاشت کا رنگ تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ خوشگوار عمومی

تبدیلیاں بڑی حد تک ماحول کے بدلنے، جائے قیام کے پُرفضا ہونے، صاحب حیثیت مگر سلیم الطبع اُولاد کی خدمت کیشی، بہترین صاف ستھری غذاؤں کی فراہمی، مولینا کی روایت کے مطابق مکمل پابندیٔ اوقات اور ملاقاتیوں کے ہجوم اور مسائل کی یورش میں کمی کا نتیجہ تھیں۔

البتہ معلوم ہوا کہ جوڑوں کا درد بدستور ہے اور ابھی چند ہی روز پہلے (ایک ہفتے سے زیادہ نہیں) درد کا علاج ایک جدید ترین معالجاتی تکنیک سے شروع ہوا ہے۔ یعنی مشین کے ذریعے فوق السماعت قسم کی سوتی لہریں پیدا کی جاتی ہیں جو ماؤف جوڑوں اور ہڈیوں تک حرارت کی لہروں میں بدل کر پہنچتی ہیں اور گوشت سے گذر کر براہ راست مقاماتِ درد پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اندازہ یہ ہوا کہ اس طرز علاج کا جس کا ایک کورس دو ماہ کا ہے، قدرے اچھا ہی اثر ہے۔ مگر اس کے اثرات کا صحیح اندازہ ۲۰، ۲۵ دن کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ مولانا کہہ رہے تھے کہ اگر یہ علاج مفید رہا تو ضروری مشینیں خرید کر واپس پاکستان لے آؤں گا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بطور علاج مولینا کو ۶، ۷ سیڑھیاں چڑھنے کا تجربہ بھی کرایا جا رہا ہے۔ لیکن فی الحال اس تدبیر علاج کے بارے میں یہ رائے قائم کر لینا کہ مولینا تو اب سیڑھیاں چڑھنے لگے ہیں، درست نہیں ہوگا۔ اگرچہ ہماری خواہش یہی ہے کہ مولینا اس قابل ہو جائیں۔ فی الحال یہ تدبیر علاج ہے، نتیجۂ علاج نہیں۔ اس اثناء میں خلیل حامدی صاحب اور نیویارک کے ذکی الدین صاحب بھی آچکے تھے۔ چائے کا دَور بھی چلا اور باتوں کا حلقہ بھی وسیع تر ہو گیا۔ مولینا نے مجھ سے بھی اور خلیل صاحب سے بھی اِدھر کے حالات دریافت کیے۔ مختصر اًضروری باتیں بتائیں۔ ذکی الدین صاحب نے اسلامی یونیورسٹی کے بارے میں مولینا سے مشورہ طلب کیا۔ خاصا وقت گذر جانے پر ہم نے مولینا سے خود ہی عرض کیا کہ اب شاید آپ کو بیٹھنے میں زحمت ہو رہی ہے۔ آپ واپس تشریف لے جائیں۔ اور ہمارا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ مولینا مصافحے کر کے تشریف لے گئے۔

صحبت روشن دلاں یک دم، دو دم   آں دو دم سرمایۂ بود و عدم

شام کا کھانا ڈاکٹر احمد فاروق ہی کے ساتھ کھایا گیا۔ دسترخوان پر دال کی موجودگی امریکہ میں پاکستانیت کے حلول پر دلالت کر رہی تھی۔ ۱۰ ر ۱۱ بجے ہم تینوں مسافرانِ بے منزل قریبی قصبہ بفیلو کے لیے روانہ ہو گئے جہاں سے اگلے دن ڈیر ائیسٹ جانا تھا۔

مولینا کی صحت کے سلسلے میں بعد کی تازہ اطلاع یہاں یہ ملی کہ آٹھ دس روز پہلے (۲۳ر جولائی کو)

اُن کو ایک خاص قسم کا انجکشن ریڑھ کی ہڈی میں لگایا گیا جس سے کمر اور کولھوؤں کے درد میں بہت کمی ہو گئی ہے۔ چہرے کی رنگت بھی بہتر ہو گئی ہے۔ قبض کی شکایت بھی دُور ہو گئی ہے۔ اب چلنے میں بھی پہلے جتنی تکلیف نہیں ہوتی۔ دوسرا انجکشن جو کچھ عرصے بعد لگنا تھا، اب تک لگ چکا ہو گا۔ خدا کرے کہ گھٹنوں کے درد کے لیے بھی خدا کوئی ذریعہ شفا مہیا فرما دے۔ اور مولینا زیادہ سے زیادہ بہتر صحت و قوت کے ساتھ واپس آکر تحریک اسلامی کی مزید خدمت انجام دے سکیں۔

امریکہ میں مختلف ممالک کے مسلمانوں کی خاصی آبادی ہے اور ان میں بہت سے لوگوں کو اچھے درجے کے عہدے یا کاروبار حاصل ہیں۔ ان میں دینی طور پر حساس مسلمانوں کی بڑی اکثریت ہے جو ایک طرف یہ جذبہ رکھتے ہیں کہ اسلام سرزمینِ امریکہ میں پھیلے، اور دوسری طرف وہ ایسی تجاویز سوچتے رہتے ہیں کہ جن کے ذریعے وہ مادہ پرست معاشرے کے فکری سماجی اور اخلاقی مفاسد سے اپنا اور اپنی آئندہ نسلوں کا بچاؤ کر سکیں۔

ایسا ہی ایک پروگرام ہمارے ایک دوست ذکی الدین صاحب کے دل نے تجویز کیا۔ انہوں نے یہ سوچا کہ ہماری نوجوان اولادیں امریکہ کے اندر سے بھی، اور مسلم ممالک سے آکر بھی اپنے آپ کو امریکی یونیورسٹیوں کے حوالے کر کے جس طرح ایک باطل تہذیب اور ایک غلط نظامِ فکر سے متاثر ہوتی ہیں اس کا توڑ یہی ہو سکتا ہے کہ یہاں ایک اسلامی یونیورسٹی کی تشکیل کی جائے جو آرٹس کے علاوہ سائنس اور انجینئرنگ کے مضامین کی بھی اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنے۔ اپنے اس خیال کی دلکشی کے چند اور قدردان بھی ملے، جن کے ذہنی اور مالی تعاون سے انہوں نے اسلامی یونیورسٹی کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کر لیا۔ مئی کے اوائل میں مجھے اُن کا دعوت نامہ ملا۔ اس میں مجھ سے چاہا گیا تھا کہ میں اپنی تقریر میں یہ بتاؤں کہ علم اور تعلیم ہی انقلاب امامت کا ذریعہ ہیں۔ ابتداً ارادہ تھا کہ چلا جاؤں گا۔ بعد میں صحت پر دو حملے ایسے ہوئے کہ میں نے طے کر لیا کہ اتنے طویل سفر کی کھکھیڑ اُٹھانا میرے بس کا روگ نہیں چنانچہ سفر کے لیے کسی بھی قسم کی تیاری کا خیال چھوڑ کر میں دوسرے مشاغل میں لگ گیا۔ جون کے شروع میں ذکی الدین صاحب نے نیویارک سے براہ راست مجھے ٹرنک کال کر کے کانفرنس کی صورتِ حال سے آگاہ کر کے تقاضا کیا کہ اگر تم بھی نہ آئے تو ہماری پوزیشن بہت خراب ہو گی۔ دوسری طرف انہوں نے امیر جماعت

میاں طفیل محمد صاحب کے ذریعے الگ دباؤ ڈالا۔ چار و نا چار سر تسلیم خم کر دیا ۔ روانگی سے پانچ چھ دن پہلے جانے کا فیصلہ ہوا جب کہ پاسپورٹ سمیت کاغذات تیار نہ تھے ۔ نہ دوڑ بھاگ کے لیے میرے پاس وقت تھا ۔ برادر عزیز فیض الرحمٰن صاحب (دار العروبہ ، منصورہ) نے بھرپور تعاون بہم پہنچایا ۔ یہاں تک کہ ۱۹ ر کو میں لاہور سے روانہ ہو گیا ۔ خیال تو تھا کہ کانفرنس کے پہلے روز ہی پہنچ جاؤں گا ، مگر سفر میں ایسے پیچ و خم پیش آئے کہ بس آخری روز کے اجلاس ہی میں شرکت کر سکا ۔ کئی مندوبین یا مہمان دوسرے شہروں سے آئے ہوئے تھے ۔ اور ان میں سے کچھ چلے بھی گئے تھے ۔ اجلاس میں خواتین کا بھی خاصا تناسب تھا ۔

میرا خیال ہے کہ میں اس تقریر کا خلاصہ بھی عرض کر دوں جو میں نے اسلامی یونیورسٹی کانفرنس نیویارک کے آخری اجلاس میں کی تھی ۔

انگریزی کے آٹھ دس جملوں میں تاخیر سے پہنچنے ، اور انگریزی زبان میں ایک اہم موضوع پر خاص تیاری کے بغیر جس کا وقت ہی نہ ملا تھا) گھٹی ہوئی تقریر روانی سے نہ کر سکنے کی معذرت کرنے کے بعد ، میں نے اردو میں اپنے خیالات کا اظہار کیا جن کا انگریزی ترجمہ اجلاس میں پیش کر دیا گیا ۔ پھر کچھ سوالات ہوئے ، ان کے جوابات عرض کیے گئے ۔

میری تقریر کے نکات یہ تھے :

۱۔ دنیا میں جب کبھی کوئی انقلاب آتا ہے تو اس کے پیچھے ایک خاص طرح کا سرمایۂ علم اور ایک فکری نہج کام کر رہا ہوتا ہے ۔ انقلاب کا سلوگن یا طغریٰ ایک خاص طرح کے علم کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔

۲ ۔ اس سرزمین پر جب انقلاب آیا تو اس کے ہاتھ میں اعلامیہ آزادی کا پرچم تھا ۔ یہ اعلامیہ انسانیت کے احترام اور اسے خدا کی طرف سے ملنے والے غیر منفک مساویانہ حقوق آزادی کے اعتراف پر مشتمل تھا ۔

ؔلہ سوچا میں تو ارادہ یہ تھا کہ جانے سے پہلے تقریر کا انگریزی ترجمہ مطبوعہ صورت میں لے جاؤں گا اور اس کو پڑھ دوں گا ، نیز مطبوعہ کاپیاں تقسیم کر دی جائیں گی ۔ مگر بعد میں تو اردو کی تقریر کو بھی بطور خاص تیار کرنے کا موقع نہ ملا تقریباً فی البدیہہ ہی بات کرنی پڑی تھی ۔

امریکی اعلامیۂ آزادی میں کچھ ایسی سچائیاں تھیں کہ جن کی طرف ساری دنیا کی توجہ مبذول ہوئی اور ایک نگاہ اُمید سے اقوامِ عالم نے اس طرف دیکھنا شروع کیا کہ اس انقلاب سے اب کیا ظہور میں آتا ہے۔

۳- لیکن جب عملاً امریکہ کی نئی سیاسی زندگی تاریخ کی راہ پر چلی تو امریکہ کی اصل ریڈ انڈین آبادی اور افریقہ سے جبراً پکڑ پکڑ کر لے جائے ہوئے غلاموں کی نسل کو خداوندانِ تہذیب کے ہاتھوں نہایت خوفناک وحشیانہ سلوک سے گزرنا پڑا۔ اسی کے ساتھ ساتھ سرمایہ پرستی نے زور پکڑا، طبقاتی تقسیم بڑھتی گئی، انتخابی سازباز، سیاسی جوڑ توڑ اور سفارتی ہیر پھیر اپنی مکروہ شکلوں کے ساتھ نمایاں ہونے لگے، جرائم کی افزائش، اخلاقی فرومائیگی اور جنسی بے راہ روی نے معاشرے کی مذہبی و روحانی اقدار اور انسانی رابطوں کو تباہ کرنا شروع کیا اور ملحدانہ، مادہ پرستانہ اور حیوانی تصورِ حیات پوری طرح چھا گیا۔

۴- اس تجربے نے شہادت دی کہ امریکی انقلاب اور اس کے اعلامیۂ آزادی کے پیچھے جو علم کام کر رہا تھا وہ پوری طرح حقیقت و صداقت کا آئینہ دار نہ تھا۔

یہی بات انقلابِ برطانیہ و فرانس پر بھی منطبق ہوتی ہے۔

۵- آج یہ بات اور بھی نمایاں ہو گئی کہ امریکہ جس روز افزوں سرمایۂ علم کے بل پر کھڑا ہے، وہ اسے اتنا معمولی سا منصفانہ نقطۂ نظر دینے میں کوتاہ ہے کہ ایک جیسے حالات کے لیے یکساں اُصول برتے جائیں۔ اگر اسرائیل جوہری بم بنا لے اور اس کے لیے بحری قزاقی سے یورینیم حاصل کر لے، اور بھارت کئی کئی ایٹمی بھٹیاں اور ری ایکٹر قائم کر کے جوہری دھماکہ بھی کر لے تو اس سے کوئی وجہ پریشانی پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن پاکستان اگر محض صنعتی پاور کے حصول کے لیے جوہری توانائی سے کام لینے کی تگ و دو کرے تو پوری ڈپلومیٹ قوت اس کے خلاف صرف کر دی جائے، خصوصاً یہودی ذہن کے تحت کام کرنے والی پروپیگنڈا مشینری اسلامی ہائیڈروجن بم کی ایسی شاندار کہانی تیار کر کے پھیلاتی ہے کہ مغرب کا ذہین و فطین آدمی یوں محسوس کرتا ہے کہ بس بم اُس کے سر پر آ کے پھٹا کہ پھٹا۔ اتنا ہی نہیں، امریکی ڈپلومیسی کھلم کھلا روس اور بھارت اور اسرائیل کو اُکساتی ہے کہ وہ پاکستان کے جوہری مرکز کو تباہ کرنے کے لیے جارحانہ اقدامات کریں، بلکہ آخری اطلاع یہ ہے کہ خود امریکہ کے وائٹ ہاؤس میں ایسی کھسر پھسر ہو رہی ہے۔

پھر یہ دیکھیے کہ امریکی انقلاب جس کی اساس ہی اس تصور پر ہے کہ ایک (اپنی بھاری اکثریت کے نقطۂ نظر کے مطابق) جس طرح کا سیاسی نظام چاہے قائم کرے اس میں کسی کو مداخلت کا حق نہیں ہے (باقی برصفحہ ۳۸)

(بقیہ اشارات) اس پر فخر کرنے والی حکومت ایران کی مسلم قوم کی مرضی سے قائم ہونے والی حکومت کو ناپسند کرتی ہے اور طرح طرح سے خفیہ مداخلتیں اور پروپیگنڈے کی تراکیب استعمال کر کے اُسے ناکام یا خراب کرنا چاہتی ہے۔
امریکہ کسی قوم یا اقلیت کی نسل کشی کا مخالف ہے۔ مگر حال ہی میں بھارت میں جمشید پور، علی گڑھ، سری نگر اور مغربی بنگال کے علاقوں میں صرف مسلم اقلیت کے جان و مال اور آبروؤں کی بڑے پیمانے پر تباہی عمل میں آتی ہے۔ اس پر امریکہ کو کوئی اضطراب نہیں ہوتا۔ اور اس سے پہلے بھی بارہا مسلم کش فسادات ہو چکے ہیں، اُن کے لیے امریکہ نے نہ اقوام متحدہ میں، نہ بھارت میں ڈپلومیٹک تعلقات کے واسطے سے اور نہ پروپیگنڈے کے ذریعے مسلمانوں کی نسل کشی کے اس مسلسل عمل کو روکنے کی کوئی کوشش کی ہے۔
کیا یہی نسل کشی اریٹیریا میں، فلسطین میں، فلپائن میں، برما میں نہیں ہو رہی۔ کیا کیا امریکہ نے؟ ویت نام سے دو لاکھ کی تعداد میں چینی نسل کے جوان، بوڑھے، بچے، عورتیں حکومت کے رویے سے تنگ آ کر اپنے گھر بار اور کاروبار چھوڑ کر، ترکِ وطن کرتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر اپنے آپ کو سمندر کے حوالے کر دیتے ہیں۔ دُنیا کا کوئی ملک انہیں قبول کرنے پر تیار نہیں۔ قلیل سی تعداد کو امریکہ نے قبول کیا، مگر باقی بھاری تعداد کا حشر وہی ہو گا جو ڈیڑھ دو لاکھ کا ہو چکا۔ یعنی سمندر میں ڈوب جائے۔
اس طرح دُنیا کے چپے چپے پر انسانی حقوق پامال ہو رہے ہیں، مگر انسانی حقوق کا نعرۂ مستانہ لگانے والے کارٹر صاحب کا ایک رُواں بھی حرکت میں نہیں آتا۔

جو علم عالمی سربراہی کرنے والی ایک بڑی قوم کو انصاف کے ایک بنیادی اصول کا قائل اور اس پر عامل نہیں بنا سکا۔ وہ اس قابل نہیں ہے کہ انسانیت کی رہبری کر کے اُسے امن و سلامتی تک لے جائے۔

۲۔ دوسری بار دُنیا نے بڑی اُمیدوں کے ساتھ اشتراکی انقلاب کے ساز سے اُٹھنے والے نغمۂ مساوات پر توجہ مبذول کی۔ مگر چند ہی سال کے عملی تجربات نے بتایا کہ یہ انقلاب انسانوں اور انسانوں کو لڑا کر بے تحاشا خونریزی کرانے والا، محنت کشوں کو بے بس کر کے یک جماعتی آمریت کی گرفت میں دینے والا، ایک نئے طرز کی طبقاتی تقسیم اور آمدنیوں کی تفاوت پیدا کرنے والا اور ساری دُنیا میں خفیہ سازشی سرگرمیاں پیدا کرنے والا ہے آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود اشتراکی معاشروں میں تقسیم کا عمل شروع ہوا اور دُنیا بھر کے مزدوروں کو ایک

کرنے والے خود ایک نہ رہ سکے ———— خود روس میں اشتراکی تسلط کی سخت گیریوں کے باوجود حقوق طلبی کی اجتماعی آوازیں اُٹھنے لگیں، ادیبوں اور سائنسدانوں نے اس نظام جبر کے خلاف اس کے اندر سے آواز اُٹھائی جس کے نتیجے میں کئی ممتاز شخصیتوں کو جیلوں اور پاگل خانوں میں رہنے کے علاوہ ملک سے نکلنا پڑا۔

بین الاقوامی لحاظ سے چیکوسلوویکیہ اور ہنگری کو زیر اثر لینے کے لیے جس عریاں جارحیت سے کام لیا گیا اُسے تو ہم دُور کے لوگ پوری طرح سمجھ نہ سکے تھے، لیکن اب ہمارے بالکل پڑوسی مسلم ملک افغانستان میں ہتھوڑے درانتی کا جو رقص شروع ہوا ہے۔ اس کے اسرار و رموز کیسے چھپے رہ سکتے۔ سازشی راستے سے قتل و غارت کر کے ترکی حکومت مسند آرا ہوئی۔ پھر علماء اور قوم کے با اثر افراد کو ہزاروں کی تعداد میں تلواروں اور صلیبوں کا شکار بنایا گیا، بالآخر پہاڑوں میں بسنے والے عوام بے سروسامانی کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ملک کا بڑا حصہ ترکی حکومت اور اس کے سرپرست روسیوں کے قبضے سے چھڑا لیا۔ یہ اتنا بڑا خونی ریفرنڈم دُنیا کے سامنے ہو گیا ہے کہ اب کسی بدترین ظالمانہ کارروائی سے رُوس پورے افغانستان کو کچل کے بھی رکھ دے تو بھی جو حقیقت سامنے آ چکی ہے اس پر خط نسخ نہیں کھینچا جا سکتا۔

اس ساری تاریخ سے کیا ثابت ہوتا ہے کہ یہ اشتراکی انقلاب مساوات انسانی اور غیر طبقہ داری معاشرے اور محنت کش کی قدر و قیمت کو بڑھانے کے جن نعروں کے ساتھ اُبھرا تھا، اُن کی بنیاد جس علم پر تھی وہ ناقص علم تھا۔

۷۔ دراصل موجودہ دَور کا وہ سرمایۂ علم اساس کے اعتبار سے ایک ہی ہے جس کے سرچشمے سے مغربی اقوام اور اشتراکی قوموں نے استفادہ کیا ہے۔ یعنی ایسا علم جو حواس اور قیاس کے ذرائع سے حاصل شدہ ہے۔ اب وہ حقائق جو حواس اور قیاس کی گرفت میں نہیں آ سکتے، لیکن جن کو متعین کیے بغیر زندگی کا مقصد اور منہج طے نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کے بارے میں ملحدانہ اور مادہ پرستانہ علوم گونگے ہیں۔

۸۔ جامع اور مکمل علم، جس کی روشنی میں انسانی زندگی راہ ہدایت پا سکتی ہے۔ وہ وہ ہے جس میں حواس و قیاس کی کوتاہی کو پورا کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ علم اسلام کا بہم پہنچایا ہوا علم ہے اور اسلام حواس اور قیاس کی کوتاہیوں کو علمِ وحی سے پورا کرتا ہے۔

۹۔ اب اگر احیائے اسلام کی مہم اور اسلامی انقلاب برپا کرنے کی تحریک ہمارے پیش نظر ہو تو

اس کی اوّلین ضرورت یہی ہے کہ اس العلم کو موجودہ اور نئی نسلوں کے ذہنوں میں راسخ کر دیا جائے جس کی بنا پر ہمارا یہ طرز طے ہوا تھا کہ اسلام کا مقصد اللہ کے بندوں کو، غیر اللہ کی بندگی و طاعت سے نکال کر اللہ کی بندگی و طاعت میں لانا ہے۔

۱۰۔ اسلامی فلسفۂ علم کی رُو سے علم کے دو بڑے شعبے ہیں۔ ایک علم ابدان، دوسرے علم ادیان۔ آجکل کی دنیا علم ابدان میں بہت آگے نکل گئی ہے، یعنی اشیاء۔ موجودات، فلزات اور حرکت و حرارت کے علوم میں بہت ترقی ہوئی ہے۔ ان علوم کے بل پر انسانیت نے معاشی لحاظ سے اور دفاعی لحاظ سے بڑی قوت حاصل کی ہے، مگر جہاں تک انسانی رویوں اور رابطوں اور زندگی کی قدروں اور غایات کا معاملہ ہے، علم کے اس دوسرے شعبے میں جدید دَور بہت ہی پسماندہ ہے بلکہ وہ اسی مقام پر ہے جہاں جاہلی اور وحشیانہ دَور کی اقوام تھیں۔ ہماری بڑی قوموں کی سرپرستی میں پرورش یافتہ تہذیب ایک لنگڑی تہذیب ہے جس کا ایک پاؤں تو چاند اور مریخ تک پہنچتا ہے مگر دوسرا دلدل میں پھنسا رہ گیا ہے۔

علم کے دونوں شعبوں کو مساویانہ اور متوازن طور پر ہم آہنگ رکھ کر آگے بڑھنا اسلامی حکمت ہے۔

۱۱۔ اسلام آیا تو کچھ اعلامیے اور منشور اس کی طرف سے پیش کئے گئے تھے، عملاً وہ سب جوں کے توں پورے ہوئے، انسانوں کو مساوات و عدل کا وہ مقام ملا جس کی کوئی دوسری مثال کسی دوسری قوم یا سلطنت یا تحریک کی طرف سے سامنے نہیں لائی جا سکتی۔ انسانوں نے جس رفتار سے معاشی ترقی کی جس رفتار سے دفاعی قوت حاصل کی، اس کے مقابلے میں اُن کا اخلاقی استحکام کچھ زیادہ ہی تھا، اور اس کی وجہ سے اُن کی اوّل الذکر سرگرمیوں میں بھی زیادہ جان تھی۔

۱۲۔ یہاں میں امریکہ والوں سے اور ساری جدید دُنیا سے یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام کی جو ڈراؤنی تصویر آپ کے سامنے متعصب پادریوں اور کج نظر مستشرقین نے تیار کر کے رکھی ہیں، اس کی قید سے نکل کر اسلام کو اس کی اصل صورت میں جاننے سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اسلام کوئی خوفناک نظام نہیں، بلکہ وہ ایک نظامِ رحمت ہے۔ وہ دس برس کی جس کشمکش کے نتیجے میں ۱۰ لاکھ مربع میل پر قائم ہوا تھا، اس میں خود حملہ کرنے والے دشمن کی صرف ۵۹، جانیں گئیں۔ یہ غیر خونی اور مصلحانہ انقلاب جب کامیاب ہوا تو

محض اختلاف رائے کی بناء پر کسی ایک فرد سے بھی تعرض نہیں کیا گیا۔ اسلامی ریاست کے سربراہوں نے غیر مسلم معذوروں کو بھی بیت المال میں سے وظائف دیے۔ جس طرح اسلام کے معیاری دور میں اقلیتوں کے معبدوں اور ان کے دینی اکابر، اور ان کے عام حقوق کی حفاظت کی گئی۔ آج کی کوئی مہذب ترین حکومت بھی ویسی مثال پیش مثال نہیں کرسکتی۔ غیر مصافی لوگوں، بوڑھوں، بیماروں، عورتوں اور بچوں پر تلوار اٹھانے کا مسلم سپاہیوں کو اذن نہ تھا۔ کبھی سرحدیں بند نہیں کی گئیں، کبھی معاہدات نہیں توڑے گئے ایک ادنیٰ غلام نے بھی اگر کسی دشمن کو امان دے دی تو ساری جماعت نے اس کا احترام کیا۔ اسلامی معاشرے میں اسراف اور تبذیر کی ممانعت تھی لہٰذا ایسی اونچ نیچ کبھی نہ پیدا ہوسکی کہ ایک بڑا طبقہ روٹی کپڑے اور مکان سے محروم رہے۔ اگر کسی شخص کی کوئی ضرورت اٹکی تھی تو اسے پورا کرنے کے لیے اس کے رشتہ دار اور اس کے پڑوسی ذمہ داری محسوس کرتے تھے۔ بصورت دیگر سب سے اوپر قوم کا خزانہ موجود تھا کہ وہ اس کی کفالت کرے۔

۱۳۔ آج اسی نظامِ رحمت کے احیاء کی تحریکیں جہاں جہاں نتائج دکھا رہی ہیں۔ وہاں امریکہ اور مغرب والے مزاحمانہ سازشوں اور پروپیگنڈے سے کام لے رہے ہیں حالانکہ انہیں چاہیے کہ وہ ان تجربوں کو بلا مداخلت برگ و بار لانے دیں۔ کیا عجب کہ مادہ پرستی جس نقطہ ناکامی پر آکے رک گئی وہاں سے آگے ایک نیا راستہ نکل آئے۔

میں امریکہ اور یورپ کے شہریوں اور خصوصاً نوجوانوں سے کہتا ہوں کہ وہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اسلام کو خود سمجھیں اور اپنے معاشروں میں خود اسلامی انقلاب کے علمبردار بنیں۔

ہر معقول آدمی کو ایسے نظامِ رحمت کا خیر مقدم کرنا چاہیے اور اسے براہ راست اس کے سرچشموں سے سمجھنا چاہیے۔ علم و حکمت کے اس دور میں ذہین نوجوانوں کا شعور متعصب پادریوں اور مستشرقوں کے بنائے ہوئے قفس میں محبوس رہے تو یہ بہت افسوسناک ہے۔

۱۴۔ یہ ہے وہ نظامِ رحمت جس کے بنیادی علم کو فروغ دینے کے لیے اس کانفرنس کا انعقاد کیا گیا ہے۔ آپ سارے امکانات کو دیکھیے اور ذرائع کا جائزہ لیجیے۔ اس کام کو آج آپ کرسکیں یا کچھ مدت بعد، جب بھی جو قدم اس کے لیے اٹھا سکیں، وہ قدم اسلامی علوم کے فروغ کے لیے ہوگا اور نتیجتاً انقلابِ امامت کے لیے۔

اسلامی یونیورسٹی امریکہ کے داعی ذکی الدین صاحب بڑے مخلص اور دردمند آدمی ہیں، انہوں نے ایک اسلامی مکتبہ چلا رکھا ہے، اور ہم نے دیکھا کہ وہ سفر میں کتابوں کے بھاری کارٹن ساتھ لے کے نکلے، اور جہاں گئے اُن کی رسد طلب سے کم رہی۔ وہ ایک جامع مسجد "مسجد فاروق" کا انتظام چلانے میں بھی پیش پیش ہیں جو خرید کردہ عمارت میں واقع ہے۔

اُن کے خلوص کو ملحوظ رکھ کر ہی بعد کی کسی پرائیویٹ نشست میں خود اُن کے بات چھیڑنے پر عرض کیا گیا کہ یونیورسٹی کے کام کو اگر کرنا ہو تو اس کی منزل اوّل یہ ہے کہ آپ یہاں کے مسلم ماہرین تعلیم کی ایک کانفرنس بلائیں اور اس میں پبلک کو مدعو نہ کریں، بلکہ خود اپنے لیے اُن سے رہنمائی حاصل کریں کہ آیا یہ خیال قابلِ عمل ہے، اس کے مسائل کیا کیا ہیں؟ اس کی مشکلات اور ضروریات کون کونسی ہیں؟ کام کی اسکیم کیا ہونی چاہیے؟ طلبہ، اساتذہ، نصاب، عمارت اور مصارف کا بھی تصور ہونا چاہیے؟ یہ بھی اندازہ لگایا جائے کہ اس میں کتنی مدت لگے گی اور اس مدت میں کس تدریج سے کون کون سے اقدامات ہوں گے؟ اس طرح ایک واضح نقشہ کار (BLUE PRINT) مرتب ہو جانا چاہیے جسے آپ کسی بھی جگہ بات کرتے ہوئے پیش کر سکیں۔ نیز صحیح طریق کار یہ ہوگا کہ آپ ایک اسلامی یونیورسٹی بورڈ یا کوئی کمیٹی وغیرہ تعلیم، انتظامی امور، قانون کے ماہرین پر مشتمل تشکیل دیں جس میں فروغ اسلام کے لیے کام کرنے والے جنون کیش کارکن نیز کچھ مالدار اصحاب شامل ہوں۔ اس بورڈ یا کمیٹی میں آپ کو مناسب مقام دیا جائے لیکن مقام جو بھی ملے، آپ کی توجہ اس پر رہے کہ کام بہترین معیار سے ہو سکے۔ آگے چل کے یہ بورڈ یا کمیٹی اسلامی یونیورسٹی ٹرسٹ قائم کر کے اس کے تحت اموال و املاک کو اکٹھا کرے۔ جب تک یہ نہ ہو آپ صرف دو کام کر سکتے ہیں: ایک یہ کہ اپنے جذبہ و خیال کو پھیلاتے رہیں، دوسرے یہ کہ کم سے کم ایک اسلامی مدرسہ یا ہائی اسکول سال دو سال میں قائم کر دیں، ممکن ہے کہ اس ابتداء کو آگے وسعت مل جائے۔

یہ بات بہرحال بالکل برادرانہ طور پر اُن کے ذہن نشین کر دی گئی کہ ابھی آپ بالکل سرسری ابتدائی اسٹیج میں ہیں۔

مختصراً میں اپنے رفقاء کو یہ بتا دینا مفید خیال کرتا ہوں کہ امریکہ میں مقامی (زیادہ تر سیاہ فام اور کم تعداد میں سفید فام) مسلمانوں سمیت جملہ تقریباً ۲۰ لاکھ مسلمان آباد ہیں۔ ان میں عرب، ایرانی،

ہندوستانی، پاکستانی، ترکی، ملائی، انڈونیشی اور افریقی سبھی علاقوں کے لوگ ہیں۔ ان مسلمانوں نے کچھ مراکز تبلیغ کے لیے اور کچھ سنٹر عبادات و تقاریب اور علمی و تعلیمی کاموں کے لیے کھول رکھے ہیں۔ کہیں ایک محلے یا شہر کے تعلق سے سب مجتمع ہیں، کہیں اپنے اپنے ملک اور اپنی زبان کے رابطے کے تحت۔ ایسے سنٹر اور مراکز مختلف شہروں اور قصبوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ صرف نیو یارک شہر میں چھوٹے بڑے سنٹروں کی تعداد یک صد سے زیادہ یا کچھ کم ہو گی۔ تبلیغی کام رابطۂ عالم اسلامی کے مبلغین کے علاوہ پاکستان اور بھارت کی تحریک اسلامی کے متاثرین کرتے ہیں۔ پھر اپنی خاص طرز کی سرگرمی کے ساتھ تبلیغی جماعت کے وفود کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایم ایس اے نامی تنظیم بھی اس میں حصہ لیتی ہے۔ ایم ایس اے اس معنی میں توڈھیلی اور نرم تنظیم ہے کہ اس میں مختلف ملکوں کے لوگ، مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف صلاحیتیں رکھنے والے اور اسلام سے مختلف درجوں کی وابستگی رکھنے والے لوگ شامل ہیں۔ لیکن اس تنظیم نے جو اوّلاً مسلم طلبہ کی تنظیم کی حیثیت سے قائم ہوئی تھی، اپنے حلقۂ تنظیم میں زیادہ سے زیادہ تعداد سمیٹ لی ہے۔ اس ادارے کا ایک بڑا مرکز ہے، اس کے تحت چھوٹے مراکز ہیں۔ اس کا اپنا پریس ہے، اپنے جرائد ہیں، مختلف زبانوں میں کتابیں چھپتی ہیں۔ نمازوں اور افطار و سحر کے اوقات نامے شائع کیے جاتے ہیں۔ نماز روزہ کے علاوہ ازدواجی اور دوسرے معاملات میں مسائل شرعیہ کو بھی انگریزی زبان میں چھاپا جاتا ہے۔ ڈاکٹروں، انجینیروں، سوشل سائنٹسٹوں، ماہرین تعلیمات اور اسی طرح کے دوسرے مخصوص دائروں کے ماہرین کی کانفرنسیں بڑے پیمانے پر منعقد کی جاتی ہیں۔ ایم ایس اے کی سالانہ کانفرنس بہت عظیم الشان ہوتی ہے۔ ایم ایس اے کا ایک شعبہ جیلوں میں قید کاٹنے والے سیاہ فاموں کو دعوتِ اسلامی کا مخاطب بنائے ہوئے ہے۔ عام طور پر کام خط و کتابت اور لٹریچر سے چلایا جاتا ہے۔ خاص صورتوں میں اُن کو امداد بھی دی جاتی ہے۔ جیل کے افسروں سے رابطہ کر کے بعض مسائل حل کرائے جاتے ہیں۔ اس کوشش کے نتیجے میں مسلمان ہونے والوں کی تعداد اوسطاً ۱۵۰ افراد ماہانہ ہے اس کے ڈائرکٹر ایک قابل نوجوان ڈاکٹر انیس احمد ہیں۔

اسلام کے تحریکی تصوّر کا شعور رکھنے والے حضرات مختلف شہروں اور دیہی علاقوں میں اپنے اجتماعات کرتے ہیں۔ دوسرے دعوتی حلقوں سے تعاون بھی کرتے ہیں۔ ایم ایس اے جیسی تنظیموں میں بھی حصہ لیتے ہیں۔

یہ امر بہت مبارک ہے کہ سخت مصروف زندگی میں مرد اور خواتین وقت نکالتے ہیں ۔ دین کے لیے جمع ہوتے ہیں، جگہ جگہ قرآن و حدیث کے درس ہوتے ہیں، مساجد میں نمازیں ہوتی ہیں، جمعہ کے اجتماعات ہوتے ہیں اور عیدین پہ تو مقررہ مقامات پہ میلوں کی طرح ہجوم ہوتا ہے ۔ کتنے ہی ماہانہ، ہفت روزہ، سائیکلو سٹائل کیے ہوئے، رسائل اور اخبارات اور خبر نامے اور دعوت نامے، جگہ جگہ سے شائع ہوتے ہیں ۔ ان ساری سرگرمیوں کے لیے خدا کے بندے خاصی رقوم خرچ کرتے ہیں ۔ باہر سے مناسب شخصیتوں کو بھاری رقوم خرچ کر کے بلواتے ہیں اور پھر اُن کے دوروں کے لیے مزید انفاق کرتے ہیں ۔

اجمالاً یہ تصویر میں نے اس لیے پیش کی ہے کہ یہاں کے خادمانِ تحریک اسلامی کو ان باتوں سے خوشی ہوگی کہ آج خدا کے فضل سے امریکہ جیسے ملکوں (نیز برطانیہ، فرانس، جرمنی، بلجیم، ناروے، سویڈن وغیرہ) میں بھی ہماری اذانیں گونج رہی ہیں ۔ کتنی ہی جگہ تو گرجوں کی عمارات خرید کر مساجد تیار کی گئی ہیں خدا مختلف طریقوں سے اپنے دین کے غلبے کے سامان کر رہا ہے فالحمد للّٰہ علیٰ ذٰلک ۔

امریکہ میں مسلمانوں، خصوصاً داعیانِ حق کی مشکلات بھی ہیں، ان میں کچھ کمزوریاں بھی پائی جاتی ہیں ۔ وہاں کے حالات کی وجہ سے وہ بعض پیچیدگیوں میں بھی گھر جاتے ہیں، مگر میرا خیال یہ ہے کہ وہ مشکلات و موانعات کے آگے جھکنے کے بجائے اپنا راستہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اس وجہ سے بعض اصحاب کا یہ رویہ مناسب نہیں کہ وہ اُن کو ملامت ہی کرتے رہتے ہیں ۔

ایک اہم سوال پردے کے متعلق میرے سامنے آیا ۔

جواباً عرض کیا کہ اگرچہ بعض حالات میں بعض مجبوریاں خواتین کے پردے کی حدود پہ وقتی طور پر اثر انداز ہو سکتی ہیں، لیکن جونہی مجبوری رفع ہو، پردے کے حدود کو اپنی جگہ قائم ہو جانا چاہیے ۔ رہے وہ لوگ جو مغربی معاشروں میں جا کر یہ خیال کرتے ہیں کہ شریعت کا قانون پردہ بالکل ختم ہی ہو گیا تو اُن کا سوچنا درست نہیں ۔ ایسے لوگ تو خود ہمارے اپنے ملک میں بھی ہیں، جنہوں نے "ترقی" کی مجبوری کے تحت قرآن و حدیث کی (نعوذ باللہ) تصحیح کر لی ہے ۔

ایسے لوگ بڑی روشن مثال ہیں جو امریکہ یا یورپ میں رہ کر بھی پردہ کرتے ہیں ۔ ایک خاتون کو میں

جانتا ہوں، وہ برقع اوڑھتی ہیں اور دوسروں میں برقعے کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ اس کے لیے تیار رہتی ہیں کہ جہاں کوئی برقعے کے سِل نہ سکنے کا عذر کرے، اُسے خود سی دیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں کہ جو اس خوبی کے لیے مشہور رہیں کہ اُن کی بیویاں مستقلاً پردہ کرتی ہیں۔ صرف مجبورانہ استثنائی حالات میں وہ بادلِ ناخواستہ پردے کے اصول وحدود میں کوئی کمی کرتی ہیں۔ میں نے اجتماعات میں ایسی نوعمر لڑکیوں کو دیکھا جنہوں نے اگرچہ برقع اوڑھا ہوا نہیں تھا۔ مگر اپنے سروں اور گردنوں پر ایسا کپڑا لپیٹ رکھا تھا جس میں صرف اُن کی آنکھوں کے لیے دیکھنے کا خلا تھا۔ اور بقیہ لباس بھی اتنا ڈھیلا اور سادہ تھا کہ کسی طرح اس پر زینت کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ میں نے ایک دکان کے سامنے ایک بلالی مسلم کے ساتھ دس بارہ سال کی ایک بچی کو کھڑے اس حال میں باتیں کرتے دیکھا کہ وہ سیاہ رنگ کا مکمل برقع اوڑھے ہوئے تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس معمر شخص کی بیٹی یا بھتیجی ہو گی۔

دوسرا اہم سوال اس امر پہ اُٹھا کہ امریکہ میں انفرادیت اور آزادیٔ رائے کی جو آب و ہوا اوّل روز سے پائی جاتی ہے وہ اِدھر سے جانے والے مسلمانوں پہ بھی اثر کرتی ہے بلکہ بہت باشعور قسم کے اہل ایمان و دعوت بھی اس کی زد میں آتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ بعض دوستوں میں اجتماعیت کی جگہ تفرد[1] بہت جلد پیدا ہو جاتا ہے اور اس تفرد کے ساتھ عجیب چکر در چکر فلسفے نمودار ہوتے ہیں ان فلسفوں میں جو غوطے کھاتا رہ گیا اُسے خدا ہی بچائے۔

میں نے کسی مجلس میں موقع ملنے پر عام اصولی سی یہ باتیں عرض کیں کہ اہل ایمان میں باہم محبت ہونی چاہیے ان کا ملنا اور ایک دوسرے سے رخصت ہونا خدا کے لیے اور خدا کے دین کے لیے ہونا چاہیے۔ انہیں تمام معاملات و مسائل میں اجتماعی فضا میں غور و بحث کے ساتھ مشورے کرنے چاہئیں اور مشورے سے جو کچھ طے ہو اُس پر سرگرمی سے عمل کرنا چاہیے۔ آپس میں حسنِ ظن ضروری ہے۔ کوئی دوسرے کے خلاف محض اختلافات

[1] مثلاً میرے لیے یہی مثال عرض کر دینا کافی ہے کہ ایک دوست اسلامی یونیورسٹی کا تخیل لے کے اُٹھے ہیں۔ دوسری طرف ایک اور دوست مشرق و مغرب یونیورسٹی (EAST & WEST UNIVERSITY) کے پروگرام کے علمبردار ہیں۔ ان دونوں میں کوئی رابطہ اس موضوع پر نہیں ہوا۔ میں ان دونوں کو یکساں قابل توجہ سمجھتا ہوں۔

کی وجہ سے غیبت کا ارتکاب نہ کرنے ۔ میں نے وضاحت کی کہ کسی شخص کی ایک رائے یا تجویز کا ختم ہو جانا اس سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ اجتماعیت ختم ہو جائے ، یا باہمی محبت و رابطہ ختم ہو جائے ، یا ایک منحدہ نظامِ کار ختم ہو جائے۔

ساتھ ہی میں یہ کہہ دوں کہ تمام لوگ جن سے میں ملا اُن کو مخلص پایا ، کوئی شرارت پسند اور فتنہ گر نہیں ہے ۔ بات محض اختلافات کی ہے جو انسانی زندگی اور اجتماعی سرگرمیوں کا لازمہ ہیں ۔ کمی صرف یہ ہے کہ ہمارے دوستوں نے اسلامی فلسفۂ اختلاف کو متعین طور پر نہیں سمجھا ۔ اور یہ بات امریکہ ہی کے لیے خاص نہیں ۔ خود ہمارے اندر بھی کسی نہ کسی حد تک کام کرتی رہتی ہے ۔ ملکی سطح پر تو آپ حضرات علماء کو دیکھتے ہیں کہ وہ چھوٹے چھوٹے اختلافات کو افتراق کا ذریعہ بنا لیتے ہیں ۔ حق یہ ہے کہ کوئی اجتماعیت اسلامی فلسفۂ اختلاف کو اچھی طرح سمجھے بغیر چل ہی نہیں سکتی ۔

یہاں جو تذکرۂ احباب ہوا ، اس سے غلط فہمی نہ ہو کہ کوئی خاص قضیہ ہے قضیہ کچھ بھی نہیں ۔ بات صرف اتنی ہے کہ وہاں چونکہ تربیت گاہوں کا انعقاد آسان نہیں ، زیادہ وقت کے اجتماعات نہیں ہو سکتے اس وجہ سے مختلف زرخیز ذہنوں میں جن نئی نئی آرا اور سوالات کی نشوونما ہوتی رہتی ہے ، ان سے نہ سب لوگ آگاہ ہو سکتے ہیں اور نہ اُن کے جوابی پہلو واضح ہو سکتے ہیں ۔ عملی صورت یہ ہے کہ ہونے والے کام ہوتے جاتے ہیں اور متفرق آرا کی روئیدگی وقتی بہار دکھا کر مرجھا جاتی ہے ۔ بس اتنا کرم اللہ کا ہے کہ دوستیاں اور محبتیں اور اجتماعیت سلامت رہے ۔ بظاہر ایسا ہے ۔

اس پر میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔

جہاں جہاں بھی جانا ہوا ، اور جن اجتماعات میں بات کی جا سکی ، مخاطب دوستوں کو (جن میں بسا اوقات دوسرے ممالک کے مسلم نوجوان بھی ہوتے) حسب ذیل اُمور کی طرف توجہ دلائی ۔

۱۔ آپ حضرات مختلف ملکوں اور علاقوں اور زبانوں سے تعلق رکھنے کے باوجود دعوتِ اسلامی کے لیے مل کے کام کریں ، اور اپنے اپنے ملکوں کے مخصوص مسائل بھی صرف اپنے حلقے تک محدود نہ رکھیں بلکہ دوسرے علاقوں کے دوستوں کو بھی اُن سے آگاہ کریں ۔ میں نے کہا کہ ایران کا انقلاب ہو یا افغانستان کے مسلم قبائلیوں کا جہاد ، یا ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کا مسئلہ ، یا عراق اور شام میں پیدا ہونے والی نئی

صورتِ حالات، یا مصر کے معاہدۂ امن کے نتائج و اثرات، ایسے تمام مسائل ہم سب کے مشترک مسائل ہیں۔ ان پر مل جل کر سوچنا چاہیے اور آپس میں تعاون کرنا چاہیے۔ اپنی اپنی تنظیمیں اور سنٹر الگ رکھتے ہوئے بھی مہینے دو مہینے میں ایک بار سب کو شہر بہ شہر مشترک اجتماع کرنے چاہییں۔

۲۔ ایران کے پورے حالات بیان کر کے میں نے اس پر توجہ دلائی کہ وہاں کا بڑا مسئلہ مغربی قوموں کا مخالفانہ ردِّ عمل ہے جو پروپیگنڈے کی شکل بھی اختیار کرتا ہے اور سازشوں کی بھی۔ پس ایران کو مسلمانانِ عالم کی اخلاقی تائید و حمایت ملنی چاہیے۔

۳۔ ہندوستانی مسلمانوں کو حالیہ مسلم کش فسادات نے جس بری طرح اپنی خونی چکی میں پیسا ہے اس کا اجمالاً تذکرہ کر کے میں نے مخاطبین کو توجہ دلائی کہ یہاں کے چھوٹے سے چھوٹے سنٹر کی طرف سے نہ صرف بھارتی حکومت اور اس کے سفارت خانے کو احتجاج پہنچنے چاہییں بلکہ آپ لوگ مسلمان حکومتوں سے تقاضا کریں کہ وہ بھارتی حکومت پر اثر انداز ہو کر مسلمانوں کا تحفظ کریں۔ نیز اقوام متحدہ کے سکرٹری کو احساس دلائیں۔ اس سلسلے میں جہاں تک ہو سکے لاکھوں متاثرین کے لیے مالی امداد بھی بھجوائیں۔

۴۔ افغانستان کی صورتِ حالات کا نقشہ پیش کر کے میں نے توجہ دلائی کہ اس معاملے میں بھی مسلم حکومتوں کو توجہ دلائیں کہ وہ روس کی پشت پناہی سے ترہکی کی اقلیتی حکومتوں کے ہاتھوں افغانی مسلمانوں کی اکثریت کی خونریزی اور نسل کشی کو بند کرانے اور مجاہدین کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے اپنا فرض ادا کریں خصوصاً ڈیڑھ لاکھ سے زائد مہاجرین کو تو لازماً وسیع پیمانے پر امداد ملنی چاہیے۔ کاش کہ مسلمان ملکوں کی انجمن ہلال احمر اتنی مضبوط ہوتی کہ وہ خالص انسانی ہمدردی کی بنا پر مہاجرین کی امداد کے لیے میدان میں اتر جاتی۔

۵۔ آخر میں میں نے پاکستان کے سیاسی حالات کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا کہ اس وقت ملحد اشتراکی اور مفاد پرست گروہ کی سرگرمیاں اور تیاریاں ایسی ہیں کہ ہمیں ان کے خلاف آئندہ انتخابات میں ایک فیصلہ کن معرکے سے گزرنا ہوگا۔ اس معرکے میں ہمارے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے آپ حضرات جس بھی طریق سے حصہ لے سکتے ہوں، لیں۔ یہ سمجھ لیں کہ اس وقت پاکستان میں اسلام کی مضبوطی کی راہ نکلنے کی صورت میں ایران اور افغانستان کو بھی استحکام حاصل ہوگا اور بھارت کے مسلمانوں کو بھی سہارا ملے گا۔ بصورتِ دیگر اگر ہم اور آپ اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہ رہ گئے تو ایران، افغانستان

اور ہندوستان ـــــ پورے خطے کے مسلمانوں کے حق میں مضر ہوگا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہ اس فرض کا خاصا گہرا احساس وہاں موجود ہے اور میں نے (اور خلیل حامدی صاحب نے) اس احساس کو اور زیادہ مؤثر بنانے کے لیے خاصا کام کیا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

(بقیہ مقامِ غم)

کی بشری خطاؤں اور کمزوریوں سے درگذر فرما کر اُن کے جذبۂ ایمانی اور اُن کی خدماتِ ملی و انسانی کو اپنی خاص قبولیت سے نوازے۔

مولینا ابوالخیر مودُودی کی تعزیت کے سلسلے میں جنرل محمد ضیاء الحق صدر پاکستان، میر علی احمد تالپور وزیر دفاع، جنرل سوار خاں گورنر پنجاب، سفیر مصر کے علاوہ بے شمار دیگر محبّوں کی طرف سے مولینا ابوالاعلیٰ مودُودی اور مرحوم کے اہلِ خانہ سے اظہارِ ہمدردی کے جو تار اور خطوط موصول ہو رہے ہیں، اُن کا فرداً فرداً جواب دینا مشکل ہے۔ میاں طفیل محمد صاحب امیر جماعتِ اسلامی پاکستان، حسین فاروق مودُودی مہتمم ادارہ ترجمان القرآن اور ابوالبرکات (مرحوم کے صاحبزادے) سب اپنے ہمدردوں اور خیر خواہوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور ان کے لیے فلاح وسعادت کی دُعا کرتے ہیں۔ (نعیم صدیقی)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے لیے دُعائے صحت کی اپیل

حال ہی میں اطلاع ملی ہے کہ بفیلو (امریکہ) کے ہسپتال میں مولانا مودودی کے معدے کا آپریشن ہو رہا ہے چنانچہ امریکی وقت کے مطابق ۱۲ بجے (مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۷۹ء) کو یہ مرحلہ بخیریت گزر گیا۔ آج (۵ ستمبر) صبح ۶ بجے حسین فاروق مودودی نے اپنے بھائی ڈاکٹر احمد فاروق مودودی سے ٹیلیفونی رابطہ کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ آپریشن جو ڈھائی گھنٹے جاری رہا بخیر و خوبی مکمل ہوا۔ مولینا کے رفقائے مقصد قارئین ترجمان القرآن اور جملہ مسلمان بحالیٔ صحت کی دعا کریں۔ (ادارہ)